© rasailojaraid.com

اسلام کے تاریخی ارتقاء کی نوعیّت

عبدالحمید صدیقی

(۲)

اسلام کا دوسرا امتیازی وصف جس نے اس کے ارتقاء کا ایک خاص انداز اور رُخ متعین کیا وہ عقیدہ ختمِ نبوت ہے ۔ اس عقیدہ کی رُو سے چونکہ وحی اور الہام کا سلسلہ نبی آخر الزمان پر ختم ہو چکا ہے اس لیے کوئی شخص بھی اب اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کی کسی بات کو الہامی سمجھ کر بلا چون و چرا قبول کر لیا جائے ۔ کوئی صوفی، کوئی عالم اور کوئی حاکم بطور عقیدہ غیر مشروط اطاعت کا مطالبہ نہیں کر سکتا ۔ حافظ ابن قیمؒ نے اپنی مشہور تصنیف اعلام الموقعین میں بڑی تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے اور قرآن و سنت سے یہ ثابت کیا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات سے ہٹ کر اگر کوئی شخص کسی چیز کی پیروی کرتا ہے تو وہ گمراہی ہے ۔ یہاں ہم حافظ صاحبؒ کی تصریحات کی تلخیص پیش کرتے ہیں ۔

قرآن مجید نے ایک نہیں متعدد مقامات پر اس حقیقت کو بڑی وضاحت اور قطعیت کے ساتھ بیان فرما دیا ہے کہ حق و صداقت کی راہ وہی ہے جس کی باری تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ نشاندہی کر دی ہے اور جس پر حضور سرورِ دو عالم نے خود چل کر اس کے نشیب و فراز سے پوری انسانیت کو آگاہ فرما دیا ہے ۔

لہ ہماری ساری بحث حافظؒ کی کتاب سے ماخوذ ہے جو حضرات اسے تفصیل کے ساتھ دیکھنا چاہتے ہوں وہ اعلام الموقعین جلد اوّل کی فصل "فی تحریم الافتاء فی دین اللہ بالرأی المتضمن لمخالفۃ النصوص والرأی الذی لم تشہد لہ النصوص بالقبول" کی طرف رجوع کریں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (الاعراف - ۲)

لوگو! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔

اس آیت میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ ہدایت و رہنمائی کا واحد سرچشمہ وہ تعلیم ہے جو بنی نوع انسان کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ملی ہے۔ اس ایک منبع کے سوا کسی دوسرے منبع سے افکار و اعمال کے جو دھارے بھی نکلیں ان کی پاکیزگی کے بارے میں کوئی بات بھی یقین اور وثوق کے ساتھ نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ یہ اُس سرچشمہ سے رواں نہیں ہوتے جو ہر لحاظ سے مامون و محفوظ ہو۔ وہ علم جس کا ماخذ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت نہیں، اس میں باطل کی آمیزش کے سارے امکانات موجود ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے مقام پر بڑی تاکید کے ساتھ یہ حکم دیا گیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا۔ (النساء: ۵۹)

اے ایمان لانے والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو۔ اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔

اس آیت کی جو تشریح حافظ ابن قیم نے کی ہے ہم یہاں اُس کا ترجمہ پیش کرتے ہیں:

"اَطِيْعُوا کے لفظ کو جس طرح باری تعالیٰ نے اپنے لیے ارشاد فرمایا ہے اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہؐ کی اطاعت باری تعالیٰ کی اطاعت کی طرح مستقلاً واجب ہے لیکن اولوالامر کے بارے میں اطیعوا کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اولوالامر کی اطاعت مستقلاً واجب نہیں بلکہ رسول کی اطاعت کے تابع ہے۔ یعنی صاحبِ امر جو حکم حضور سرورِ دو عالم کی متابعت میں دے اُسے بسروچشم تسلیم کیا جائے اور جو حضورؐ کی لائی ہوئی تعلیمات سے بے نیاز ہو کر دیا جائے اُسے ماننے سے انکار کر دیا جائے۔ حضورؐ نے خود اس ضمن میں نہایت واضح طور پر فرمایا ہے لاطاعة لمخلوقٍ فی معصیة الخالق۔ (کسی مخلوق کی اطاعت خالق کی نافرمانی میں نہیں)۔ بعض دوسرے مقامات پر یوں ارشاد فرمایا۔ انما الطاعةُ فی المعروف۔ (اطاعت صرف معروف میں ہے)" فمن امرکم منھم بمعصیة اللہ فلا سمع لہ ولاطاعة" (اصحابِ امر میں سے جو کوئی تمہیں اللہ کی نافرمانی کا حکم دے تو اس کے معاملے میں نہ سمع ہے اور نہ اطاعت)۔ اس ضمن میں حضور سرورِ کائنات کی وہ حدیث قابلِ غور ہے جس میں حضورؐ نے اُن لوگوں کے حق میں جو اولی الامر کے حکم کی تعمیل میں آگ میں کودنے کے لیے تیار ہو گئے تھے فرمایا کہ اگر یہ اُس میں کود پڑتے تو ہمیشہ آگ ہی میں رہتے۔ یہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ اللہ اور اُس کے رسول کے علاوہ کسی دوسرے کی غیر مشروط اطاعت جائز نہیں۔

پھر قرآن مجید کا یہ ارشاد کہ "اگر تمہارے درمیان نزاع ہو جائے تو اُسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو" اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ امت کے مختلف افراد کے مابین نیک نیتی کے ساتھ اختلاف ہو سکتا ہے اور یہ اختلاف انہیں دائرۂ ایمان سے خارج نہیں کرتا۔

فان تنازعتم فی شیءٍ میں لفظ شیءٍ کو نکرہ استعمال کیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس اختلاف کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں اور ان ساری صورتوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں آخری فیصلے کے لیے ایک صاحبِ ایمان اللہ اور اُس کے رسول کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اللہ کی طرف رجوع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی کتاب کو حکم مانا جائے اور اُس کے رسول کی طرف رجوع کرنے سے مراد آپ کی حیات طیبہ میں تو آپ کی ذاتِ گرامی کی طرف رجوع کرنا ہے اور آپ کے بعد آپ کی سنّت سے سند صداقت حاصل کرنا ہے“۔

حافظ ابن قیم نے محوّلہ بالا آیت کی تصریح میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ اس حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے کہ اولوالامر اور عام افرادِ امت کے مابین اختلاف ہو سکتا ہے اور یہ اختلاف اگر نیک نیتی پر مبنی ہو تو کسی لحاظ سے بھی قابلِ مذمت نہیں۔ چونکہ ہر شخص کے سوچنے سمجھنے کا انداز اور صلاحیت ایک دوسرے سے مختلف ہے اس لیے یہ ناممکن ہے کہ سارے افراد کا زندگی کے ہر معاملے میں ایک ہی نقطۂ نگاہ ہو۔ قرآن مجید نے اس اختلاف کو دُور کرنے کا یہ طریقہ بتایا ہے کہ جن حضرات کے درمیان اختلاف رونما ہو جائے وہ آخری فیصلے کے لیے کتاب و سنّت کی عدالت میں اپیل کریں کیونکہ یہ وہ سب سے اونچی عدالت ہے جہاں سے انہیں بالکل بے لاگ فیصلہ مل سکتا ہے۔ مفسرین کرام نے اسی آیت سے اُن لوگوں کے نظریہ کی بھی تردید کی ہے جو رسولِ معصوم کے علاوہ مستقل ائمۂ معصومین کا بھی وجود تسلیم کرتے ہیں۔ ہر امام، ہر صاحبِ علم، ہر مفسر و محدّث، ہر مصلح اور صوفی اپنی ساری بزرگیوں کے باوجود بہرحال غیر معصوم ہی ہے اس لیے ان میں سے کسی کی بھی غیر مشروط اطاعت جائز نہیں۔ اطاعت اور فرمانبرداری صرف معروف ہی میں صحیح اور درست ہے۔

اسلام کے اس بنیادی تصور نے مسلمانوں کے فکری اور عملی ارتقاء کا ایک ایسا رخ متعین کیا ہے جو دوسری اقوام سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ تاریخ کا یہ ایک عجوبہ ہے کہ انسان نے اصحابِ عقل پر بڑی شدومد سے تنقید کی، اُن کی آرا سے اختلاف کیا اور جس معاملے میں انہیں کوئی لغزش محسوس ہوئی اس کا برملا اظہار کیا اور اس سارے کام کو پُورے اطمینانِ قلب کے ساتھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سرانجام دیا لیکن اصحابِ کشف کی ہر بات کو کلامِ الٰہی سمجھ کر فوراً قبول کیا اور ان کے مکاشفات کو وہی اہمیت اور فیصلہ کن حیثیت دی جو اللہ کی کتاب اور اُس کے رسول کی سنت کو دی جاتی ہے۔

ہم یہاں اس وقت اس بحث میں نہیں پڑتے کہ ایک صاحبِ عقل کی عقلی تصریحات زیادہ صحیح ہوتی ہیں یا کسی صاحبِ کشف کے مکاشفات۔ عقل کی افادیت اپنی جگہ مسلّم، مگر مذہبی لٹریچر اس بات کی بار بار تصریح کرتا ہے کہ عقل اپنی ساری کامرانیوں کے باوجود تنہا انسان کی رہنما نہیں بن سکتی۔ یہ انسان کی دوسری صلاحیتوں کی طرح محدود ہے۔ اس پر انسان کے ذاتی رجحانات، اُس کے احساسات اور مفادات کی پرچھائیاں برابر پڑتی رہتی ہیں۔ اس لیے اس کے فیصلوں میں وہ بے لوثی اور انصاف پیدا نہیں ہو سکتا جو کسی صحیح نظامِ اخلاق کے لیے ضروری ہے عقل کے پیروں کو جذبات، تعصبات، زمان و مکان کے اثرات برابر متاثر کرتے رہتے ہیں اس لیے عقل جب تک وحی والہام کی روشنی میں آگے نہیں بڑھتی اس وقت تک منزلِ مقصود حاصل نہیں کر سکتی اور اگر وہ اس روشنی کے بغیر خود آگے بڑھنے کی کوشش کرے تو وہ تاریکیوں میں بھٹکتی پھرتی ہے اور بسا اوقات پھسل کر نہایت خوفناک اور مہیب غاروں میں جا گرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب کے اندر وحی والہام کو ہمیشہ فیصلہ کن حیثیت حاصل رہی ہے اور عقل کی ساری تصریحات اور توجیہات کی قدر و قیمت کا اندازہ وحی کی میزان پر تول کر کیا جاتا ہے۔ عقل کے معاملے میں اسلام اور دوسرے مذاہب کا نقطۂ نظر قریب قریب ایک ہے لیکن اصحابِ باطن کے مکاشفات کے بارے میں اسلام، دوسرے مذاہب سے ممیز و ممتاز ہے۔ چونکہ نبوت کا سلسلہ نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلّم پر ختم ہو گیا ہے اس لیے ایک مسلمان از روئے عقیدہ کسی چیز کو بھی کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ کی کسوٹی پر پرکھے بغیر قبول نہیں کر سکتا۔ وہ اصحابِ کشف کے باطنی مشاہدات خواہ وہ اُن کے لیے کتنی غیر معمولی اہمیت کے حامل ہوں اسی صورت میں قبول کرے گا جب وہ اللہ اور اُس کے رسول کی تعلیمات کے عین مطابق ہوں۔ اسلام وہ پہلا دین ہے جس نے اصحابِ خرد اور اصحابِ کشف کو ایک ہی مقام پر لا کر کھڑا کیا ہے۔ وہ ان دونوں کے تجربات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے فائدہ اٹھاتا ہے لیکن ان میں سے ہر ایک کے تجربے اور مشاہدے کو وحی اور الہام کی روشنی میں پُوری طرح پرکھ کر قبول کرتا ہے۔ ان میں سے جو چیز وہ دینِ حق کے مطابق پاتا ہے اُس کی پذیرائی کرتا ہے۔

اللہ کی کتاب اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کو خود اصحابِ کشف نے بھی فیصلہ کُن حیثیت دی ہے اور انہوں نے مسلمانوں کو بار بار اس بات کی تلقین کی ہے کہ وہ اُن کے کسی قول یا فعل کو جب تک وہ اُسے اللہ اور اُس کے رسول کے بتلائے ہوئے معیار پر پُوری طرح پرکھ نہ لیں، قبول نہ کریں کیونکہ اُن کے مشاہدات خواہ کتنے صحیح ہوں لیکن وحی والہام کی طرح سو فیصد لغزش سے محفوظ و مامون نہیں ہو سکتے۔ ان مشاہدات میں بھی انسانی تجربات اور عقلی تصریحات کی طرح مشاہدے کرنے والے کے ذاتی رجحانات اور میلانات اپنا رنگ بھر دیتے ہیں۔ انسان کی محدود صلاحیتوں کے اثرات خواہ وہ عقل کا میدان ہو یا کشف اور مجاہدۂ باطن کا، ہر جگہ ظاہر ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے بڑے بڑے صوفیا جنہیں ائمۂ تصوف کہنا چاہیے انہوں نے بھی اس امر کا پُوری طرح اعتراف کرتے ہوئے بتایا ہے کہ معیارِ حق صرف تعلیماتِ الٰہی اور سنتِ رسول ہے اور اسی کے مطابق ہر تجربے اور مشاہدے کی قدر متعین کرنی چاہیے۔ مجدد الف ثانیؒ نے اپنے مکتوبات میں کئی ایک مقامات پر اس کی تصریح فرمائی ہے۔ مجدد صاحب کے علاوہ شیخ علی بن عثمان ہجویریؒ نے اپنی کتاب کشف المحجوب[1] میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فتوح الغیب[2] میں شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے عوارف المعارف[3] میں اور اسی طرح کے دوسرے بزرگوں نے بلا استثناء اپنے مشاہدات پر شریعت کی بالادستی کو تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ مسلمان جب اجتماعی طور پر کوئی کام کرتے ہیں جس میں ایک شخص

---

[1] ع ۴۴، ص ۴۷-۵۱

[2] ص ۱۰-۱۴

[3] ص ۲۳-۲۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی امامت یا قیادت ناگزیر ہوتی ہے تو وہ اس فرض کو انجام دینے سے پہلے اس حقیقت کو خود بھی ذہن میں لاتا ہے اور دوسروں کو بھی پورے مجمعے کے سامنے یاد دلاتا ہے کہ حق و صداقت کا معیار صرف اللہ اور اُس کے رسول ہیں۔ اُن کی اطاعت اور فرمانبرداری ہی میں اُس کی دنیوی فلاح اور اخروی نجات کا راز مضمر ہے۔ جمعہ سے بڑھ کر مذہبی اور روحانی اجتماع اور کون سا ہو سکتا ہے۔ اس میں امام سب سے پہلے اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ حق و صداقت کی راہ صرف وہی ہے جو اللہ اور اُس کے رسول نے بتائی ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فقد رشد ومن يعصهما فانه لا يضر الا نفسه ولا يضر الله شيئًا[1]۔	جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے اُس نے ہدایت پائی اور جو ان کی نافرمانی کرے وہ اپنی جان کو ہی نقصان دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔

خلافت ایک ایسا ادارہ ہے جو امورِ دنیا اور امورِ دین دونوں پر حاوی ہے اور اس کا سربراہ مملکت ریاست کے ہر شعبۂ زندگی کا براہِ راست ذمہ دار ہوتا ہے خواہ اس کا تعلق اخلاق و روحانیت سے ہو، یا معیشت و معاشرت سے، لیکن اپنی ساری بزرگی اور اپنی غیر معمولی اہمیت کے باوجود وہ اپنی ذات کو یا اپنی خلافت کو ہر خطا سے پاک اور منزّہ نہیں سمجھتا اور اس وجہ سے وہ بار بار اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ خوب و ناخوب، صحیح اور غلط کا پیمانہ صرف ایک ہی ہے اور وہ باری تعالیٰ اور اُس کے رسول کی اطاعت ہے اس لیے عوام کو اس معیار کے ساتھ اس کا محاسبہ کرنا چاہیے۔ اگر وہ اس معیار پر پُورا اتر رہا ہو تو وہ ان کی اطاعت کا مستحق ہے ورگرنہ عوام سے اس کا مطالبہ کرنے میں کسی طرح بھی حق بجانب نہیں۔ اس ضمن میں خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بارِ خلافت سنبھالتے ہوئے جو بصیرت افروز خطبہ ارشاد فرمایا وہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

---

[1] ابوداؤد۔ کتاب الصلوٰۃ باب الرجل یخطب علی قوس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایها الناس فانی قد ولیتُ علیکم ولستُ بخیرکم فان احسنتُ فاعینونی وان اسأتُ فقومونی۔

لوگو! مَیں تمہارا امیر بنا دیا گیا ہوں حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ پس اگر مَیں بھلائی کا کام کروں تو تم میری مدد کرو اور اگر مجھ سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے تو مجھے راہ راست پر لانے کی کوشش کرو۔

عوام کے سامنے اپنی بشریت اور اس کے فطری تقاضوں اور غلطی کے سرزد ہونے کے امکانات کا اعتراف کرنے کے بعد پھر اُس معیار کا ذکر فرمایا جس کے مطابق انہیں اپنے سربراہوں کے اعمال کا جائزہ لینا چاہیے۔

اطیعونی ما اطعت اللّٰہ و رسوله۔ فاذا عصیت اللّٰہ ورسوله فلا طاعة لی علیکم[1]

جب تک میں اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کروں تم میری اطاعت کرو اور جب مَیں اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کروں تو تم پر میری کوئی اطاعت فرض نہیں رہتی۔

مندرجہ بالا گزارشات سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ اسلام میں اللہ اور اُس کے رسول کے علاوہ کوئی ہستی اور ادارہ ایسا نہیں جو مکمل طور پر معصوم ہونے کا دعویٰ کر سکے اور اس بنا پر اُس کی غیر مشروط اطاعت اور پیروی ہم پر لازم کی گئی ہو۔

اسلام کو اس معاملے میں تمام دوسرے مذاہب پر فوقیت اور امتیاز حاصل ہے۔ یہ عقیدہ اُسے وحدتِ فکر اور وحدتِ احساس عطا کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک ہدایت کا سرچشمہ باری تعالیٰ کی ذات اور اس کا وہ مقدس رسول ہے جس کی وساطت سے اُس نے اس ہدایت کو نوعِ انسانی تک پہنچایا اور اُس کے عملی مضمرات اُس کی حیاتِ طیبہ سے واضح کیے۔ اس بنا پر مسلم قوم کی عقیدت و محبت کا مستقل مرکز و محور صرف اللہ اور اس کے رسول ہیں۔ باقی سب

---

[1] حافظ ابن کثیر البدایۃ والنہایہ ج ۵ ص ۲۴۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عقیدتیں اس ایک عقیدت کے تابع ہیں ۔

دنیا کی دوسری اقوام میں کوئی ایک قوم بھی ایسی نہیں جسے اس معاملے میں مسلمانوں کی ہمسری حاصل ہو ۔ اُن کے ہاں ہمیں بے شمار ایسے ادارے ملتے ہیں جنہیں وہ ہر نقص سے پاک سمجھتے ہیں ۔ فلسفۂ مذہب کے ماہرین نے اس اختلاف کی جو وجہ بتائی ہے وہ بالکل صحیح اور درست ہے ۔ اُن کا تجزیہ یہ ہے کہ چونکہ اسلام کے علاوہ دنیا کا کوئی ایسا مذہب نہیں جس نے حاملِ وحی کی تصریحات اور اس کی توجیہات کو پوری طرح محفوظ کر رکھا ہو اس لیے الہام ربانی کی فکری اور نظری توضیح اس کے مختلف پہلوؤں کی تشریح اور اُن کی عملی تعبیر کے لیے انہیں بعض شخصیتوں اور اداروں کو عصمت کا وہ مقام دینا پڑا جس پر درحقیقت انبیاء علیہم السلام فائز ہوتے ہیں ۔ اگر یہ بات مان لی جائے کہ ان بزرگ ہستیوں یا ان مقدس اداروں کی تصریحات ہر خطا سے بالکل پاک اور منزہ نہیں ہوسکتیں اور ان میں غلطی کا امکان ہوسکتا ہے تو پھر خود کلامِ الٰہی کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہوسکتے ہیں ۔ احکامِ الٰہی پر عمل پیرا ہونے کے لیے ان کی عملی دقتوں کو صحیح طور پر حل کرنے کے لیے اور ان کے مختلف گوشوں کی وضاحت اور صراحت کے لیے یہ ضروری ہے کہ خود باری تعالیٰ کا رسول اُس کے حکم کے تحت اور اُس کی نگرانی میں ان سارے مراحل میں انسان کی رہنمائی کرے تاکہ اُسے اس امر کا پوری طرح اطمینان ہو کہ وہ منشا الٰہی کو عین اس کی ہدایت کے مطابق پورا کر رہا ہے ۔

جن مذاہب میں لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کے علاوہ یہ منصب دوسرے افراد اور اداروں کو سونپا وہ فطری طور پر اس بات کے لیے مجبور تھے کہ ان افراد اور اداروں کے فیصلوں کو بھی ہر خطا، لغزش اور کمزوری سے اُسی طرح محفوظ و مامون سمجھیں جس طرح کہ انبیاء معصوم ہوتے ہیں کیونکہ جب تک ایک انسان کے دل و دماغ میں یہ بات پوری طرح پیوست نہیں ہو جاتی کہ وہ تعلیمات ربانی کو اُسی انداز سے اپنا رہا ہے جس کی باری تعالیٰ نے خود نشاندہی کی ہے اس وقت تک اُسے روحانی تسکین نصیب نہیں ہوسکتی ۔ مذہب کی پیروی کسی قانون کی پیروی نہیں جسے انسان بالجبر کرنے پر مجبور رہو ۔ مذہب کا تعلق ظاہری قوانین سے کہیں زیادہ دلی کیفیات سے ہے اس لیے انسان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مذہبی دائرہ میں جو کچھ کرتا ہے وہ برضا و رغبت کرتا ہے، اور اسے بڑے مقدس جذبات اور پاکیزہ احساسات کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ اور یہ چیز اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ تعلیماتِ ربانی کے عملی پہلوؤں کو بھی اتنا ہی پاک، مقدس، ہر خطا اور عیب سے پاک اور منزّہ سمجھے جتنا کہ کتاب اللہ کو سمجھتا ہے۔ یہ چیز انسانی فطرت میں داخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی مختلف قومیں جب کلامِ الٰہی کے سمجھنے اور اُسے حیاتِ انسانی کے مختلف شعبوں میں اپنانے کے لیے انبیاء علیہم السلام کی واضح اور مستند ہدایات حاصل نہ کر سکیں تو انہوں نے دوسری شخصیتوں اور اداروں کے فیصلوں کو منزل من اللہ سمجھ کر انہیں مذہبی عقیدت کے ساتھ قبول کر لیا۔

تاریخ کے اوراق ان قوموں کے ان غلط فیصلوں سے بھرے پڑے ہیں۔ بعض افراد نے مشاہدۂ باطن کرنے والوں کو نبوت کے مقام پر فائز کر کے اُن کی ہر بات کو جُوں کا توں قبول کیا، بعض نے حکمرانوں اور طاقتور لوگوں کو کلامِ الٰہی کا شارح اور ترجمان سمجھا اور اُن کی اس طرح غیر مشروط اطاعت کی جس طرح خدا کا بندہ اللہ اور اُس کے رسول کی کرتا ہے۔ بعض نے حکومت اور اس کے سربراہوں کے بارے میں یہ غلط تاثرات قائم کیے کہ ان سے کسی غلطی کا صدور ناممکن ہے۔ مسلمانوں کے ہاں مرکزِ ملت کی عصمت کا جو تصور پیش کیا جا رہا ہے وہ بھی اسی غلط نظریہ کا شاخسانہ ہے۔

معصومیت کا تاج یوں تو مختلف حالات اور مختلف ادوار میں مختلف طبقوں اور اداروں کے سر پر رکھا جاتا رہا ہے لیکن ہم یہاں صرف کلیسا اور اربابِ کلیسا کے بارے میں چند چیزیں پیش کرتے ہیں۔

عیسائیوں کے ہاں کلیسا کا پُورا نظام اس بنیاد پر قائم ہے کہ روح مقدس (HOLY SPIRIT) کو اپنے اظہار کے لیے پیکرِ محسوس درکار ہے اور یہ پیکرِ محسوس صرف کلیسا اور اس کے ارباب ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم یُوں کہہ سکتے ہیں کہ کلیسا درحقیقت وہ لباسِ مجاز ہے جس میں روحِ مقدس جلوہ گر ہوتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب رُوح ہر عیب سے پاک اور ہر خطا سے منزّہ ہے تو جو نظام اس کا مظہر ہے وہ بھی لازمی طور پر پاکیزہ اور منزّہ ہو گا۔ اس نظام کی جو تشریح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈارول سٹون DARWELL STONE نے ENCYCLOPAEDIA OF RELIGION AND ETHICS میں کی ہے وہ قابلِ غور ہے:

نظامِ کلیسا ایسے زندہ افراد سے عبارت ہے جن میں سے ہر فرد روحِ مقدس کا حریم ہے[1]۔" پھر اس نظام کی تقدیس زمان و مکان اور افراد سے وابستہ نہیں بلکہ یہ مستقل اور قائم بالذات ہے۔ اہلِ کلیسا کے گناہ ان کی پاکیزگی کو قطعاً متاثر نہیں کر سکتے[2]۔

اس کے بعد بڑی تفصیل کے ساتھ اس دائرۃ المعارف میں اس امر سے بحث کی گئی ہے کہ آخر کلیسا اور اربابِ کلیسا کو معصوم اور منزہ تسلیم کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ یہ بحث اس قدر طویل ہے کہ اسے چند صفحات میں سمیٹا نہیں جا سکتا مگر اس کا اساسی تصور وہی ہے جس کی طرف ہم نے گذشتہ صفحات میں اشارہ کر دیا کہ تعلیماتِ الٰہی کو جب تک کوئی ہادیٔ برحق عمل کے سانچوں میں ڈھال کر دنیا کے سامنے پیش نہیں کرتا اس وقت تک اُن کے سارے گوشے پوری طرح بے نقاب نہیں ہو سکتے۔ تعلیماتِ الٰہی کی تقدیس برقرار رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اُس کی عملی تعبیر کا فرض بھی وہی فرد یا ادارہ سرانجام دے جو منشاءِ الٰہی کا پوری طرح رازداں ہونے کی وجہ سے اُسے خالق اور مالک کی مرضی کے عین مطابق اور اُس کی رہنمائی میں پوری واضح کر سکتا ہو اور پھر اپنے عمل سے اس کے عملی پہلو بنی نوعِ انسان کے ذہن نشین کرا سکے۔ اس امر کی وضاحت ایک عیسائی فاضل کی زبان سے ملاحظہ فرمائیں:-

"کلیسا ایک زندہ ادارہ ہے جو پوری دنیا کی مسیحیت کو ایک سلک میں منسلک کر دیتا ہے اور افراد کے ایمان کی نشو و نما کرتا اور اُسے قوت و توانائی فراہم کرتا ہے

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے ENCLOPAEDIA OF RELIGION & ETHICS VOL. III. P. 124

[2] ایضاً۔ P. 125.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی کے ذریعہ نوعِ انسانی پر کتابِ مقدس کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں ، اور وہ منعمِ حقیقی کی رحمتوں اور نوازشوں سے مستفید ہوتی ہے ۔ اگر کلیسا بائیبل کی تعلیمات کی عملی توضیح کا فرض سرانجام نہ دے تو یہ کتابوں کے صفحات میں ہی بکھری پڑی رہیں اور کوئی انہیں اپنی زندگی میں اپنانے کی کوشش نہ کرے ۔ بائیبل کی حقیقی افادیت اس وقت سامنے آتی ہے جب کلیسا کا زندہ نظام اس کی تصدیق کرے اور پھر کتابِ مقدس کے عملی پہلوؤں کی مستند اور صحیح تعبیر پیش کر کے نوعِ انسانی کو دنیائے عمل میں انہیں اپنانے کی دعوت دے[1]۔"

کلیسا کی عمارت بلاشبہ اینٹ پتھر اور گارے سے تعمیر ہوتی ہے لیکن اس کے نظام کو تو بہرحال انسان ہی چلاتے ہیں اور انسان ہونے کی حیثیت میں اُن سے خطا اور غلطی کا صدور ہر وقت ممکن ہے ۔ اب جبکہ کلیسا کے نظام کو ہر اعتبار سے صحیح ، برحق اور ہر قسم کی غلطی سے پاک مان لیا گیا تو اس کے بعد اہلِ کلیسا کی عصمت کو تسلیم کرنا بھی نہایت ناگزیر تھا ۔ چنانچہ یہی ہوا پہلے نظامِ کلیسا کو ہر خطا سے پاک اور منزہ سمجھا گیا اور اس کے بعد آہستہ آہستہ لوگوں کو یہ باور کرایا گیا کہ یہ نظام اُسی صورت میں سو فیصدی صحیح اور درست رہ سکتا ہے جب باری تعالیٰ خود اس کے چلانے کا انتظام کرے اور جن لوگوں کے ہاتھ میں اس کے انتظام و انصرام کی ذمہ داری ہے خداوند قدوس خود انہیں ہر قسم کی لغزشوں اور خطاؤں سے محفوظ رکھے ۔ اس نظام کے بارے میں جب تک لوگوں کے دلوں میں یہ اطمینان پیدا نہ ہو جاتا کہ وہ نظام رضائے خداوندی کے عین مطابق چل رہا ہے اور باری تعالیٰ کی نگرانی میں اُس روحانی مقصد کو پورا کر رہا ہے جو تخلیقِ کائنات کی غایتِ اولیٰ ہے ، اس وقت تک انسان اُس طمانیتِ قلب سے لذت آشنا نہ ہو سکتا تھا جو ایمان کا نہایت قیمتی بلکہ لازمی جزو ہے ۔ عقیدہ مذہب کی جان اور اس کا جوہرِ حیات ہے ۔ یہی چیز

---

[1] ENCLOPAEDIA OF RELIGION & ETHICS

VOL. VIII. P. 264. INFALLIBILITY

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انسان کو مذہب کے روحانی اور اخلاقی نظام کے بارے میں وہ سکون خاطر عطا کرتی ہے جس کی اساس مادی نفع و نقصان کے بجائے ایک اَن دیکھی ذات کی رضا اور خوشنودی پر مبنی ہوتی ہے۔ پھر اسی عقیدہ سے اُس کے ہاتھ ایمان و ایقان کی وہ لازوال دولت ہاتھ آتی ہے جو آنکھوں سے مستور اور حواس سے ماوراء حقائق کے متعلق اُسے اطمینان عطا کرتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ چیز کلیسا کی عمارت سے تو حاصل نہیں ہو سکتی اس کے لیے عوام کو اُن حضرات کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا جن پر اس نظامِ کلیسا کو چلانے کی براہِ راست ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ چنانچہ عوام نے ان لوگوں کو تمام رسالت پر فائز کر کے اُن کے ساتھ عقیدت و محبت کا وہ رشتہ استوار کرنے کی کوشش کی جو انسان باری تعالیٰ کے پیغمبر کے ساتھ کرتا ہے۔

مذہبی طبقوں کی معصومیت کا تصور یکایک پیدا نہیں ہوا بلکہ یہ آہستہ آہستہ لوگوں کے دل و دماغ میں جاگزیں ہوتا چلا گیا۔ انہوں نے سب سے پہلے اس انداز پر سوچنا شروع کیا کہ پادری عام حالات میں گناہ کا ارتکاب کر سکتے ہیں لیکن جب وہ نظام کلیسا کے نمائندے بن کر کوئی بات کریں تو اس میں کوئی غلطی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ جب ایک معصوم ادارے کی نمائندگی کریں گے تو باری تعالیٰ انہیں لازمی طور پر ہر لغزش اور خطا سے محفوظ رکھے گا۔ اس ضمن میں ایک نامور پادری کا ایک خط ملاحظہ فرمائیں جو اس نے لیڈی سائمن کو ۱۸۶۷ء میں تحریر کیا تھا۔

"مجھے بیلر مائن سے اس معاملے میں پورا پورا اتفاق ہے کہ خواہ پوپ مبرّا من الخطاء ہے یا نہیں لیکن اس کی بلا چون و چرا اطاعت ہم سب پر لازم ہے۔ اس کی نافرمانی سے ہمیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔ وہ جن حقائق کی نشاندہی کرتا ہے جس قسم کی بشارتیں دیتا ہے اور جس نوعیت کی تنبیہات کرتا ہے اُن میں غلطی کا امکان ہو سکتا ہے۔ اس کے اندازِ فکر میں بھی جانبداری پائی جا سکتی ہے لیکن ان سب حقائق کو تسلیم کرنے کے باوجود یہ بات مسلّم ہے کہ وہ جب کلیسا کے نمائندے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی حیثیت سے گفتگو کرتا ہے تو اس کی زبان فیض ترجمان سے ہمارے آقا و مولا ارشاد فرماتے ہیں"[له]

اسلام اور عیسائیت میں یہ اختلاف بڑے دُور رس نتائج کا حامل رہا ہے۔ اس کا اثر یہ ہُوا کہ عیسائیت اور بعض دوسرے مذاہب کے پیروکاروں نے یا تو مذہبی طبقوں کو رسل اور انبیاء کی طرح ہر خطا سے مبرا اور اُن کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات کو ارشادِ ربانی سمجھ کر تسلیم کیا یا پھر ان کی باتوں کو سرے سے ہی رد کر دیا اور انہیں تاریک خیالی، تنگ نظری، تعصب اور جہالت کا پیکر خیال کیا۔ پھر روشن خیالوں اور مذہبی طبقوں کے درمیان ہم نہ صرف اختلافات کی ایک وسیع خلیج حائل دیکھتے ہیں بلکہ ان کے درمیان کشمکش اور سر پھٹول کا بھی ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ پاتے ہیں۔ عیسائیوں کے اندر جب بھی غور و فکر کی تحریک پیدا ہوئی تو انہوں نے سب سے پہلے اپنے مذہبی رہنماؤں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور اُن کے اثرات کو زائل کرنے پر سارا زور صرف کیا۔

اسلام میں علماء اور فقہاء کی حیثیت عیسائیت کے ائمہ سے ہمیشہ مختلف رہی ہے۔ مسلمانوں نے اپنے علماء کو کبھی مبرا من الخطا نہیں سمجھا۔ اس بنا پر وہ ان کی تصریحات سے بڑے خلوص کے ساتھ اختلاف کرتے رہے۔ اور اس وقت تک انہیں تسلیم نہ کیا، جب تک کہ انہیں اس امر کا یقین نہیں ہو گیا کہ اُن حضرات کی آرا اللہ اور اس کے رسول کی سنت سے ماخوذ ہیں اور اسلام کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ انہیں جہاں کہیں ان میں کوئی خامی نظر آئی، بڑی بے تکلفی کے ساتھ اس کی نشاندہی کی اور بڑی آزادی کے ساتھ اُس پر گرفت کی۔

مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان طرزِ فکر کے اس اختلاف نے معاشرتی، معاشی

له ENCLOPAEDIA OF RELIGION & ETHICS

VOL. VII P. 270

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور سیاسی زندگی پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے۔ معاشرتی طور پر مسلمانوں کے اندر کوئی ایسا مذہبی طبقہ پیدا نہ ہو سکا جسے دین کی اجارہ داری حاصل ہو۔ ہر شخص جس نے اسلامی تعلیمات حاصل کیں وہ طبقۂ علما میں شمار ہونے لگا لیکن یہ مرتبہ اور مقام اُس کے لیے کوئی خصوصی مراعات کے حصول کا ذریعہ نہ بنا۔ وہ معاشرے کے دوسرے افراد کی طرح زندگی بسر کرتا رہا۔ عوام اور علماء اس سے مسائل میں اختلاف کرتے، اس کی لغزشوں پر اُسے ٹوکتے، اس کی علمی تحقیقات میں جہاں کہیں انہیں کمزوری نظر آتی اس کا کھلے بندوں اظہار کرتے اور نہ صرف خود اُسے رد کر دیتے بلکہ دوسروں کو بھی اُسے قبول نہ کرنے کی تلقین کرتے۔

اسلامی معاشرے میں طبقۂ علماء کے ساتھ اس مساویانہ سلوک کی وجہ سے جمہوری اقدار کو استحکام نصیب ہوا۔ یہاں اگر جمہوریت پامال ہوئی ہے تو اس کی وجہ علما نہیں بلکہ بادشاہ اور ملوک تھے جنہوں نے اپنے ناجائز تصرف کو قائم رکھنے کے لیے عوام کے بنیادی حقوق پر ڈاکہ ڈالا۔ علما کی جو کچھ قدر و منزلت تھی وہ کچھ اس وجہ سے نہ تھی کہ باری تعالیٰ نے اُن کے طبقے کو کوئی خاص امتیازات اور حقوق دے رکھے تھے بلکہ اُن کی عزت و توقیر کا سارا دارومدار عام مسلمانوں کی طرح، اُن کی نیکی، پرہیزگاری، خدا خوفی، دین سے گہری محبت اور تعلیمات الٰہی کے صحیح فہم پر تھا۔ اور ان میں سے کوئی خوبی بھی ایسی نہیں جو ان کے ایک خاص طبقے کے ساتھ تعلق رکھنے کی وجہ سے انہیں حاصل ہو، بلکہ یہ وہ صفات ہیں جنہیں ہر شخص اپنے اندر پیدا کرنے کا پورا پورا حق و اختیار رکھتا تھا۔

اس تصور کی وجہ سے مسلم معاشرے میں علماء نے دین اور مذہب کے نام پر وہ لوٹ کھسوٹ بھی نہیں کی جس کے بڑے دردانگیز واقعات ہمیں دوسرے معاشروں میں ملتے ہیں۔ دوسرے مذاہب میں چونکہ طبقۂ علما معصوم ہونے کی وجہ سے کچھ آسمانی حقوق رکھتا تھا اس وجہ سے وہ معاشرے پر جس قسم کا جائز و ناجائز دباؤ ڈالنا چاہتا بڑی آسانی کے ساتھ ڈال لیتا۔ اور کوئی چیز اس کی راہ میں مزاحم نہ ہوتی۔ وہ لوگوں کو مغفرت کے پروانے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دنیا اور اُن کے ہاتھ جنت کے قبالے بیچتا۔ اُن پر ہر طرح کے ظالمانہ محصولات عائد کرتا۔ مسلم سوسائٹی اس نوعیت کی دستبرد سے ہمیشہ محفوظ رہی۔ یہاں اگر بعض جاہل اور دنیا پرست گدی نشینوں نے اس طرح کی مذموم حرکات کیں تو انہیں برملا ٹوکا گیا اور علمائے حق نے حق پسندوں کی پوری تائید کے ساتھ اُن کی اِن خلافِ دین کارروائیوں پر گرفت کی اور ان کے اِن ناجائز ذرائع سے کمائے ہوئے مال کو اکلِ حرام قرار دیا۔

پھر سیاسی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو مسلمانوں کے اندر عدل و مساوات کے جو احساسات و تصورات پائے جاتے ہیں ان کی تہ میں بھی یہی عقیدہ کام کر رہا ہے کہ معصوم صرف نبی کی ذات ہے، دوسرے ہر بشر سے غلطی کا صدور ممکن ہے۔ حضور سرورِ کائنات کے بعد جو کوئی اپنی بات منوانا چاہتا ہے وہ اس کے لیے دلائل پیش کرے اور ثابت کرے کہ اُس کی یہ بات اللہ اور رسول کی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ کوئی شخص اب اپنی کسی تصریح و توجیہ کو الہامی یا منزل من اللہ کہہ کر تسلیم نہیں کروا سکتا۔ اسلام اور دوسرے مذاہب کے درمیان اس باب میں کتنا اختلاف موجود ہے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ عیسائیوں کے ہاں جب جمہوری رجحانات نے زور پکڑا تو انہیں مذہب کو خیرباد کہنا پڑا۔ کیونکہ کسی معاشرے میں جمہوری اقتدار اور حقوقِ آسمانی رکھنے والے طبقے بیک وقت پنپ نہیں سکتے۔ لیکن مسلمانوں کے ہاں جمہوریت اور دین کا ہمیشہ چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ اُن کے ذہن اس تصور سے کبھی خالی نہیں ہوئے کہ اب کوئی شخص اپنی بات کو وحی اور الہام کہہ کر عوام سے بلا چون و چرا اطاعت کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ اُسے اب دوسرے ابنائے جنس کی طرح اپنی بات کو قرآن و سنت کے ترازو میں تول کر پیش کرنا ہوگا اور لوگ اسی کے مطابق اس کا وزن متعین کرکے اُسے رد و قبول کریں گے۔

© rasailojaraid.com